ڈاکٹر عطش درانی

تحقیقی خواص میں اعتباریت یا ساکھ؟

دورِ جدید میں تحقیق ایک الگ مضمون، ڈسپلن یا موضوع بن چکا ہے جس میں حاصلات سے کہیں زیادہ طریقِ کار پر زور دیا جاتا ہے۔ خواہ اس کی بنیاد میں کوئی فلسفہ کارفرما ہو یا نہ ہو۔ ادبی ولسانی تحقیق میں اسی طریقِ کار کی رسمیات (Formalities) پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

تلاش، تفتیش اور تحقیق ایک پہلو سے مترادفات کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جب ہم تحقیقی میدان یا ڈسپلن کی بات کرتے ہیں تو تلاش اور تفتیش اس کے ذیلی اجزا قرار پاتے ہیں۔ تحقیق کا مقصد محض صداقت کی تلاش اور حقائق کی تفتیش یا بازیافت نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، یہ ایک نہایت ذِمّے داری، دقتِ نظری اور ریاضت کا کام ہے۔ بعض کے نزدیک تحقیق سوال کرنے اور اس کا معروضی جواب پانے کا نام ہے۔ بعض کے نزدیک متغیرات (Variables) اور کارکردگی کی پیمائش میں تعلق معلوم کرنے کو تحقیق کہتے ہیں۔ بعض اس کے طریقِ کار اور بعض حاصلات کو تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ جب کہ تحقیق بعض مفروضات (Assumptions) کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے فرضیات (Hypotheses) کے حقائق دریافت کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ منظّم، معروضی، مدلّل اور کُلّی ہوتی ہے۔ یعنی تحقیق ایک ایسا طریقِ کار ہے جو (1) منظّم (Organized)، (2) معروضی (Objective)، (3) مدلّل (Rational) اور (4) کُلّی (Holistic) طور پر انجام پاتا ہے۔

تحقیق، صداقت کی معروضی تلاش ہے اور معروضی صداقت صرف وہی نہیں ہوتی جو کوئی ایک شخص موضوعی طور پر جانتا ہو بلکہ ضروری ہے کہ دوسرے بھی اسی کی مانند اس کیفیت کو معروضی طور ہی پر جان سکیں۔ زبان وادب کے شعبے میں تحقیق کھرے اور کھوٹے کی چھان بین یا تصدیق کرنے کو کہا گیا ہے، لیکن یہ تلاش اور تصدیق ایک باضابطہ طریقِ کار یا رسمیات کے مطابق انجام پاتی ہے۔ یہ طریقِ کار منطقی اور معروضی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں جیسا کہ اب تک ادبی شعبے میں سمجھا جاتا رہا ہے۔

جدید تحقیق کو عام طور پر فن، تکنیک یا اصول کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔ علم کے لحاظ سے یہ ایک سائنس ہے کیوں کہ اس میں سائنسی طریقِ کار استعمال ہوتا ہے تاہم جہاں تک اس کے فنی طریقِ کار کا تعلق ہے، یہ ایک تکنیک ہے جو چند بنیادی تحقیقی اصولوں پر مبنی ہے اور اپنی پیشکش یا اسلوب کے لحاظ سے یہ ایک فن ہے، کیوں کہ استدلال اور بیان، فن کارانہ چابک دستی کا تقاضا کرتے ہیں۔

زینا اولیری (Zina O'Leary) نے حال (2004ء) ہی میں تحقیق کاری پر اپنی کتاب The Essential Guide to Doing Research (2004) کو اس نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے کہ تحقیق ایک فکری شغل (Thinking game) کے ساتھ ساتھ کل ذہنی سرگرمی (Whole-brain activity) ہے۔ اس کے خیال میں تحقیق کار کو بنیادی طور پر تحقیقی تخلیقیت سے کام لینا ہوتا ہے جس میں تجزیہ اور فیصلہ ایک مسلسل عمل کی صورت میں ہوتا ہے اور ذہن کو کلی طور پر اس میں مصروفِ عمل رکھنا ہوتا ہے۔

ادبی ولسانی تحقیق کے حوالے سے تحقیق، زبان وادب میں موجود مواد کو از سرِ نو مرتب کرتی، نئی معلومات کی روشنی میں نئے نظریات وضع کرتی اور نئے نتائج سے زبان وادب کی نئی تاریخ مرتب کرتی ہے۔ اس کا بیش تر مواد ماضی اور تاریخ میں ملتا ہے اور حال پر کام نیز تجربہ بہت کم پایا جاتا ہے۔ گویا زبان وادب کی تحقیق، تاریخی اور آثاریاتی زیادہ ہوتی ہے اور جائزہ کاری یا بیانیہ اور تجرباتی کم ہوتی ہے۔ اگرچہ سائنسی طریقِ کار دونوں کے لیے درکار ہوتا ہے۔ تحقیق نہایت غیر جانب داری سے انجام دیا جانے والا عمل ہے جس میں ذاتی رائے اور پسند و ناپسند کو دخل حاصل نہیں۔ اسلام میں اسے ''عدل'' اور تکنیک میں اسے ''معروضیت'' (Objectivity) کا نام دیا گیا ہے۔

تجرباتی اور آلاتی تحقیق میں معروضیت یا غیر جانب داری بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن دستاویزی تحقیق میں معروضیت کی تلاش اور اطلاق بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ادبی فن پارے کا حسن یا زبان دان اور ادیب کی سماجی حیثیت، رجحانات اور حدود ان نازک سی معنوی تعبیرات (Connotations) میں موجود ہوتے ہیں، جنھیں معروضی گرفت میں لانا دشوار ہوتا ہے۔ فنی کیفیات کا تجزیہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ محض تنقیدی اصول برت کر جو اکثر خود بھی معروضی نہیں ہوتے، معروضی نتائج نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ معروضیت میں کوائف یا معلومات کا درست ہونا صحت کہلاتا ہے۔ کوائف اپنے متن، معیار، عصر، تصورات وغیرہ کے لحاظ سے جائز اور موزوں ہوں تو اسے ''جواز'' کہا جاتا ہے اور کوائف اپنے نتائج کے لحاظ سے بار بار ایک سے ہوں تو اسے ''وثوق'' یا ''اعتباریت'' کہا جاتا ہے۔

جدید تحقیق میں معروضیت کا ایک ہی مفہوم ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص یہی تحقیق انجام دے تو اس کے نتائج بھی وہی نکلیں جو پہلے شخص نے برآمد کیے ہیں۔ لسانی اور ادبی تحقیق میں بعض ایسے متبدل یا تبدیل ہونے والے عناصر ایسے متغیرات (Variables) ہوتے ہیں جو تحقیقی نتائج پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ وثوق کی منزل تک پہنچنے کے لیے ان متغیرات پر قابو پانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تاریخی تحقیق میں ایک بڑا متغیرہ ''وقت'' یا ''زمانہ'' (Time) ہے جس کی تحدید (Delimitation) عموماً نہیں ہو پاتی۔ یعنی اس متغیرے کے اثرات اور امکانات پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

جدید سائنسی تحقیق میں تو معروضیت کے پیمانے مقرر کیے جا چکے ہیں، چنانچہ وہاں تحقیقی ڈیزائن اور پیش کش کے خاکے طے شدہ ہیں۔ ادبی و لسانی تحقیق میں معروضیت قائم کرنے کے لیے ہر قدم پر ''عدل'' کی شرط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب پیمائشی رائے، مقداری انداز میں دی جا رہی ہو تو نہ صرف یہ کہ ذاتی تعصب، پسند و ناپسند اس میں شامل نہ ہو بلکہ مقداری پیمانے اور اسکیل مقرر کر لیے جائیں نیز اپنی ان اصطلاحوں کے مفاہیم متعین کر کے پہلے سے بیان کر دیے جائیں، جن میں کوئی رائے دی جا رہی ہو۔ معروضیت کے بغیر کوئی تحقیق، تحقیق نہیں کہلا سکتی۔ اعتبار، اعتماد، موزونیت، وثوق، جواز، صحت اور پیمانے یہ سب الفاظ معروضیت کے نکات قرار پاتے ہیں۔

اصولِ تحقیق کا اپنا بھی ایک تنقیدی پہلو ہے جس سے اس کی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ یہ تنقیدی اصول ظاہر کرتے ہیں کہ تحقیق کار کو کوئی شے گمراہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی وہ کوائف اور معلومات کو مسخ کرتا ہے بلکہ اس کے طریقوں اور نتائج کی پڑتال ہر کوئی کر سکتا ہے اور انھیں ہر وقت چیلنج کر سکتا ہے۔ یہ خصوصیت اس کی اسی معروضیت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔

موجودہ ادبی لسانی مقالات کی ایک بڑی خامی ان کی عدم معروضیت ہے۔ یعنی وثوق، جواز، موزونیت اور صحت کے حوالے سے کسی مخصوص ڈیزائن کی پیروی نہ کرنا بڑے سے بڑے تحقیقی کاموں کو پایۂ استناد سے گرا دیتا ہے۔

جدید تحقیق ایک سائنسی طریقِ کار ہے، جو مختلف مظاہر کے درمیان ربط تلاش کرتا اور اس کی معروضی تشریح کرتا ہے۔ اس کا آغاز سائنسی علوم سے ہوا۔ پھر نفسیات کے مضمون میں تھارن ڈائیک سے پیاژے تک بہت سے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ بعد ازاں علم التعلیم کے ماہرین نے انھیں آگے بڑھایا۔ وان ڈیلن، گڈ اور بیسٹ کی کتابیں حوالہ بنیں۔ پھر عمرانی اور سماجی علوم میں

یہ اصول آزمائے جانے لگے۔ یوں سماجی علوم کے واسطے سے جدید تحقیق، زبان وادب کے میدان میں داخل ہوئی ہے۔ یہ بجا کہ ادبی حقائق تلاش کرنا بہت مشکل کام ہے، لیکن یہ تو تحقیق کی ابتدا ہے منزل نہیں، ان سے کسی نقطۂ نظر یا اصول ونظریات وضع کرنا محض فرضیے کی حد تک چلے آتا ہے۔ کسی فرضیے پر صرف ایک بار تحقیق کے نتائج کو ہم کسی صورت میں آخری اور حتمی قرار نہیں دے سکتے۔ اس کے علاوہ اس کی صحت بھی مشکوک رہتی ہے، لیکن جب ایک ہی فرضیے کو مختلف جگہوں پر مختلف لوگ آزماتے ہیں اور نتائج میں یکسانیت پاتے ہیں تو نتائج میں وثوق یا اعتمادیت آجاتی ہے۔ ہم مکمل اعتماد سے یہ دعوا کر سکتے ہیں کہ فرضیہ بالکل درست ہے اور اس کے نتائج کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ سائنسی تحقیق میں اس معتبری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کوئی بھی فرضیہ وثوق حاصل کرنے کے بعد نظریہ بن جاتا ہے۔ اگر یہ نظریہ زمان ومکان کے لحاظ سے درست ثابت ہو جائے تو قانون بن جاتا ہے جیسے کششِ ثقل کا قانون، لیکن ہر نظریہ قانون نہیں بن سکتا۔ بہر حال سائنسی تحقیق کی جان وثوق میں ہے۔ ادبی ولسانی تحقیق میں عام طور پر تنقیدی اِدّعا (Dogma) سے کام لیا جاتا ہے، لیکن تحقیقی وثوق تک پہنچنے کے لیے بہت محنت اور کارگزاری درکار ہوتی ہے۔ جس کی طرف ادبی ولسانی تحقیق کو ابھی پہلا قدم اٹھانا ہے۔

جدید تحقیق میں دو امور (۱) تصورات (۲) متغیرات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ زبان وادب کی تحقیقی روایت میں ابھی تک محض نظریات کا دور دورہ تھا۔ اب تصورات اور متغیرات کے حوالے سے تحقیق انجام دینے کا آغاز ہوا ہے۔ اب شاید زبان وادب کی تحقیق بھی اس ڈسپلن میں اپنا کوئی مقام تلاش کر سکے گی، جس میں تصورات اور متغیرات کے باہم تعلق پر بحث ہو سکے۔

اصولِ تحقیق کی روشنی میں اُردو ادب کی تاریخ میں تین تحقیقی مکاتبِ فکر یا دبستان (Schools of thought) وجود میں آئے ہیں۔ جو عربی اور فارسی روایت کے بعد ''علم التعلیم''، ''نفسیات'' اور ''سائنس'' کے تحقیقی اصولوں کے اثرات سے پیدا ہوئے ہیں۔

اصولِ تحقیق کے لحاظ سے پہلا تحقیقی دبستان سرسید سے شروع ہوتا ہے، آزاد، حالی وشبلی جیسے مشاہیر اُن کے ساتھیوں میں سے تھے۔ رشید حسن خان نے اسے اُردو کا مروّج دبستان قرار دیا ہے۔ جس میں روایات جوں کی توں قبول کر لینا اور تحقیق کا مقصد محض حقائق کی بازیافت قرار دینا ہے۔ اس میں ''بہر کیف وبہر حال اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں'' کوائف جمع کرنے کا عمل انجام دیا جاتا ہے۔ تحقیقی بصیرت اور درک اس کا بھی لازمہ ہے۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر وحید قریشی، مسعود حسن خان اور

ڈاکٹر گیان چند وغیرہ اسی دبستان سے تعلق رکھنے والے سیکڑوں محققین میں سے ہیں۔ یہ تحقیق، طریقوں کو ''اصول'' قرار دیتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ''تحقیق کا فن'' اس ترتیب وتدوین پر مبنی تحقیق کے لیے ایک عمدہ بلکہ بہترین کتاب ہے۔ اس مکتبِ فکر کو ''تالیفی دبستان'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

دوسرا مکتبِ فکر یا دبستان جمع شدہ کوائف کو اصل مآخذوں سے حاصل کر کے تشریح وتوضیح کرنا اور کوئی نظریہ قائم کرنا تحقیق کا مقصد قرار دیتا ہے۔ اس کے لیے تنقیدی اصولوں کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا ڈاکٹر لائٹنر سے ہوتی ہے۔ حافظ محمود شیرانی اس کے معلمِ اوّل ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ میں اس کی پیروی قاضی عبدالودود کے سوا ابھی تک کوئی نہیں کر سکا۔ کسی حد تک مشفق خواجہ، خلیل الرحمان داؤدی اور رشید حسن خان کو اس پر عمل پیرا دیکھا۔ یہ دبستان تحقیقی اصولوں کو فن قرار دیتا ہے۔ اسے ''انتقادی دبستان'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

تیسرا مکتبِ فکر یا رجحان ''جدید سائنسی تحقیق'' کی اساس پر تحقیقی ڈیزائن اور کسی مسئلے پر فرضیوں کی جانچ پرکھ کرنا اہم سمجھتا ہے۔ اس میں مقداری اور معیاری دونوں تجزیے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس کا سرسری سا ذکر شاید علم التعلیم کی تحقیقی کتابوں کی بناء پر کیا ہے اور اُردو ادب سے مثالیں دی ہیں لیکن ابھی تک کسی بڑے محقق کی مثال انھیں نہیں مل سکی۔ شاید اُردو ادب کی تحقیق میں اس کا چلن عام نہیں ہوسکا۔ البتہ نچلی سطح پر اس کا احساس رہا۔ ''مطالعۂ احوال''، ''نفسی تجزیے'' اور ''عاداتِ مطالعہ'' جیسے موضوع اس میں استعمال ہوئے لیکن بیانیہ تقابلی جائزے جو اس طریق کی اساس ہیں، بہت کم دیکھنے میں آئے۔ ''مقتدرہ قومی زبان'' کے سیمینار ''اصولِ تحقیق'' منعقدہ ۲۵ تا ۲۷ مارچ ۱۹۸۶ء میں یہ احساس پوری طرح سامنے نہیں آیا، البتہ جدید تحقیق کی طرف اشارے اس کے بعض مباحث ومقالات میں ملتے ہیں لیکن عام طور پر ادبی محققین اس سے نابلد اور کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ پشاور یونیورسٹی، شعبۂ اُردو کے سیمینار ''ادبی تحقیق'' ۱۰ تا ۱۲ اگست ۲۰۰۲ء باڑہ گلی میں ایسی ہی رسمیات (Formalities) کی طرف خصوصی توجہ مبذول ہوئی اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد شعبۂ ''پاکستانی زبانیں'' سے اس پہلو پر دسمبر ۲۰۰۴ء میں ''اصولِ تحقیق'' کا پہلا کورس پیش کیا گیا۔ اس مکتبِ فکر میں تحقیق کو ''کُلّی رسمیات'' قرار دیا جاتا ہے۔ اس دبستان کو (اگر یہ ہے) ''تکنیکی دبستان'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

ادبیات اور لسانیات میں سائنسی طریقۂ تحقیق کا استعمال اس قسم کی تحقیق کو دنیائے علم، تحقیق میں وثوق اور جواز کے جس مرتبے پر فائز کر دے گا، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ہر قسم کے نامساعد

حالات اور جامد تعصبات کے باوصف طرزِ کہن پر اڑے رہنا، غیر سائنسی رویہ ٹھہرتا ہے اور ادبی ولسانی تحقیق کو فرضیوں کی تشکیل اور منطقی استدلال کی دہلیز پر لانے کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ اس رویے سے جس قدر جلد چھٹکارا پالیا جائے، اتنا ہی جلد ادبی ولسانی تحقیق اپنا مقام ومرتبہ پا سکے گی، جو فی الحال تحقیقی ڈسپلن کے اندر، اسے حاصل نہیں۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں ادبی ولسانی تحقیق کو جدید تحقیق کا ڈسپلن بننے کی راہ میں جو مسائل (Issues) حائل ہیں، ان میں سرِ فہرست جامعات میں ان زبانوں کے شعبوں کا جدید تحقیق کے اصولوں کے ساتھ معاندانہ رویہ ہے۔ اُردو کی ادبی تحقیق پر پہلے دو تحقیقی دبستانوں کا اثر زیادہ ہے۔ پہلا دبستان جسے ہم سرسید کی دین سمجھتے ہیں، بہر حال ''اپنے نقطۂ نظر کی تائید'' اور محض ''معلومات کی تلاش'' کو تحقیق سمجھتا ہے، فراواں ہے۔ دوسرا دبستان جسے ڈاکٹر لائٹنر کی روایت قرار دینا چاہیے اور جو ''اصل ماخذ ومصادر'' کی تشریح وتوضیح کو اپنا مقصود ٹھہراتا ہے محدود ہے۔ جب کہ تیسرا نقطۂ نظر جسے ہم پیش کرنے کی سعیِ نامشکور میں مصروف ہیں، جدید تحقیقی اصولوں پر قائم ہوتا ہے۔ ان جدید تحقیقی اصولوں کو کبھی ''ڈھکوسلے'' کہا گیا ہے اور کبھی شعبۂ ''علم التعلیم'' کے لوگوں کا مداری پن قرار دیا گیا، جہاں گڈ، بیسٹ، تھارن ڈائیک وغیرہ کے حوالے موجود ہیں یا جو ''تکنیکِ تحقیق'' کے باقاعدہ عمیق ودقیق کورسوں کی بناء پر ادب اور زبان کے شعبوں کی تحقیق کو تحقیق تصور ہی نہیں کرتے۔ ایک طرح سے دونوں شعبوں کے اہلِ تحقیق اپنے اپنے ساز وآواز میں گم اور مست ہیں۔ کبھی کبھار کوئی مرتب ومصنف انھیں جھنجھوڑتا ہے تو اسے محض ان کی تالیفی وتصنیفی ترنگ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اگر چہ اب یہ رویہ بہت حد تک دم توڑ چکا ہے اور اسلام آباد سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ ''پاکستانی زبانیں وادب'' کی طرف سے جدید ''اصولِ تحقیق'' پر پہلا کورس پیش بھی کر دیا گیا ہے لیکن ابھی اُردو اور پاکستانی زبانوں کے دوسرے شعبوں کو اپنے روایتی طریقۂ تحقیق کو خیر باد کہنے میں کچھ وقت لگے گا۔

جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے، فرضیہ عام طور پر متغیرات کا آپس میں تعلق ظاہر کرتا ہے اور تحقیق میں اسی تعلق کو درست یا غلط ثابت کرنا ہمارا اولین مقصد ہوتا ہے۔ متغیرات دو قسم کے ہوتے ہیں، جنھیں وصفی متغیرہ اور مقداری متغیرہ کہا جاتا ہے۔ وصفی متغیرہ کسی چیز کی کیفیت یا صفت کو ظاہر کرتا ہے، مثلاً خوب صورتی، اچھائی، ذہانت وغیرہ۔ ادبی تنقید اور تحقیق میں یہ متغیرہ عام طور پر موجود ہوتا ہے۔ اس متغیرے کو صحت اور پیمائش کے ساتھ پیش کرنا تحقیق کی اہم خاصیت ہے۔

مقداری متغیرہ کسی چیز یا واقعے کی مقدار کو ظاہر کرتا ہے، مثلاً طلبہ کے کسی مضمون میں حاصل کردہ نمبر، یونیورسٹی میں مطالعے کے عادی طلبہ کی تعداد وغیرہ۔ وصفی نوعیت کے متغیرے یا واقعات کی پیمائش میں محققین کو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھیں مُروّجہ پیمانوں کی مدد سے ناپا تولا جانا اور ان سے کسی نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ماہرین ایسے وصفی نوعیت کے واقعات کو مقداری متغیرات میں تبدیل کر کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اس قسم کے اعداد و شمار کو شماریاتی مواد کہا جاتا ہے۔ اس مواد پر تحقیق کے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں اور نتائج حاصل کیے جاتے ہیں۔ لسانی تحقیق میں شماریات کی مدد بھی درکار ہوتی ہے۔

اگر تحقیق کو نئے علم کی تخلیق کا ذریعہ کہا جاتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس نوعیت کی تحقیق کس قدر ساکھ اور عمدگی رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تحقیق کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ بعض مسلّمات اور عقائد کو رد کر سکے۔ تحقیقی دنیا سے باہر ''ساکھ'' کا مطلب ہے: ''قابلِ یقین، قابلِ قبول، ممکن، حقیقی اور مسلّمہ ہونا''۔ تحقیق کی دنیا میں ساکھ کے اختصاصی مطالب متعین ہوتے ہیں جن کا ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں مثلاً عمومیت معتبری، جواز، وثوق، صحت، استناد، غیر جانب داری وغیرہ۔ عمدہ تحقیق وہی تحقیق کہلائے گی جو ان معیارات پر پوری اترتی ہو۔ ہم اسے کسی بھی فلسفے (اثباتیت یا مابعد اثباتیت) کے نقطۂ نظر سے دیکھیں، یہ اپنا اعتبار اور ساکھ ہم پر قائم کرے۔ زینا اولیری نے ساکھ کے اس تجزیے کے اہم عناصر کو ان دونوں فلسفوں کی روشنی میں پانچ سوالات کے جوابات طے کیے ہیں، جو چوکھٹے میں درج ہیں۔

اثباتیت	مابعد اثباتیت
1۔ کیا موضوعیت کو سمیٹ لیا گیا ہے؟ **معروضیت:** ایسے نتائج جو جذبات، ذاتی تعصّبات اور موضوعی عناصر سے پاک ہوں۔	**غیر جانبداری:** تعصّبات اور جانب داری سے بے نیاز، خواہ موضوعیت کو تسلیم کیا گیا ہو لیکن اثرات کا جائزہ شفاف طور پر لیا گیا ہو۔
2۔ کیا طریقِ کار کا تسلسل اور تواتر موجود ہے؟ **وثوق:** اعتبار یا معتبری طریقِ کار کے تسلسل اور متواتر عمل پذیر ہونے پر ہے تاکہ بار بار دہرانے پر ایک سے نتائج آئیں۔	**انحصار پذیری:** خواہ نتائج کا معتبر ہونا ممکن نہ ہو لیکن طریقِ کار منظّم ہو، تشکیہ نگاری کے ساتھ ہو اور معروضیت کو محدود کر سکے۔

3۔ کیا مسئلے کی روح کشید کر لی گئی ہے؟ جواز: صداقت پر انحصار ہو۔ نتائج کی صحت جانچی جا سکے اور کیا طریقِ کار، انداز اور تکنیک اس مسئلے کے لیے موزوں تھے؟	استناد: صداقت کی قدر سے وابستہ ہو خواہ متعدد صداقتیں سامنے آئیں تا کہ قدر کا استحسان ہو سکے۔
4۔ کیا ماحصل کا اطلاق اس حوالے سے باہر ہو سکتا ہے؟ تعمیم: عمومیت یا فارمولا سازی ہو سکے، جس کا اس گروہ کے علاوہ عام امور پر بھی اطلاق ہو سکے۔	انتقال پذیری: ایک نمونے کے نتائج کو دوسرے نمونوں پر منتقل کیا جا سکے جو کسی اور انداز کے ہوں۔
5۔ کیا تحقیق کی توثیق ہو سکتی ہے؟ دہرائی: اگر اس تحقیق کو کسی اور تناظر میں ایسے ہی حالات اور مواد پر آزمایا جائے تو ویسے ہی نتائج سامنے آئیں۔	تنقیح پذیری: تحقیقی تناظر کی اہمیت قبول ہو سکے تا کہ دوسرے بھی دیکھ لیں کہ تحقیق ان نتائج تک کس طرح سے پہنچی یعنی طریق کار کی شفافیت۔

اعتباریت مندرجہ ذیل سوال اٹھاتی ہے، جن کا جواب تحقیقی حاصلات سے حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے، تب ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ تحقیق کار نے کس حد تک واثق اور معتبر کام کیا ہے۔ اس کی انجام دادہ تحقیق کی ساکھ یا عمدگی کس تک ہے۔

۱۔ عنوان کتنا واضح اور مختصر ہے؟
۲۔ مسئلہ کس قدر واضح طور پر بیان کیا گیا ہے؟
۳۔ تحقیقی حدود اور تحدید کہاں تک بیان کی گئی اور کیا یہ مسئلے کے مطابق ہیں؟
۴۔ کیا مفروضے واضح اور قابل فہم ہیں؟
۵۔ کیا تحقیقی اصطلاحات کی صراحت کر دی گئی ہے؟
۶۔ کیا فرضیے یا تحقیقی سوالات واضح اور جانچ کے قابل ہیں؟
۷۔ کیا فرضیے متعلقہ ادبیات کے مطالعے سے وضع ہوئے ہیں؟
۸۔ کیا سابقہ تحقیق و ادبیات کا جائزہ مختصراً اور موثر طور پر لیا گیا ہے؟
۹۔ کیا تحقیق کا طریقۂ کار بیان کیا گیا ہے اور کہیں اس سے انحراف نہیں ہوا؟
۱۰۔ کیا تحقیقی آبادی اور نمونہ کاری کو واضح کیا گیا ہے؟

۱۱۔ کیا اثر انداز ہونے والے متغیرات کو قابو میں رکھا گیا ہے؟

۱۲۔ کیا کوائف حاصل کرنے کا طریقہ واضح ہے؟

۱۳۔ کیا کوائف یا معلومات واثق اور معتبر ہیں؟

۱۴۔ کیا کوائف یا معلومات کا مؤثر تجزیہ کیا گیا ہے؟

۱۵۔ کیا مقالے کے جملے سادہ اور تحقیقی زبان میں ہیں اور مفہوم واضح کرتے ہیں؟

۱۶۔ کیا غیر ضروری جملوں سے گریز موجود ہے؟

۱۷۔ رموزِ اوقاف کا کس قدر خیال رکھا گیا ہے؟

۱۸۔ کیا حوالے صحیح طریقے سے دیے گئے ہیں اور کیا ان میں یکسانیت موجود ہے؟

۱۹۔ کیا اقتباسات کم سے کم اور مختصر دیے گئے ہیں اور زیادہ تر بات اپنے الفاظ میں کی گئی ہے؟

۲۰۔ کیا عبارت واضح اور مقالہ نگار وہی لکھ رہا ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے؟

۲۱۔ کیا غیر شخصی اور معروضی انداز اختیار کیا گیا ہے؟

۲۲۔ کیا جداول، خاکے، اعداد و شمار اور ضمیمے ضروری ہیں اور درست طریقے سے دیے گئے ہیں؟

۲۳۔ کیا مقالہ نگار نے اپنی تحقیق کے بنیادی نکتے کو ہمہ وقت سامنے رکھا ہے؟

۲۴۔ کتابیات کس حد تک موزوں اور یکساں طریقے پر دی گئی ہے۔ کیا غیر ضروری اندراجات تو شامل نہیں؟

۲۵۔ کیا نتائج اور سفارشات تحقیق پر مبنی ہیں، غیر ضروری اور اضافی طور پر تو نہیں دیے گئے؟

۲۶۔ کیا ضخامت موضوع کے مطابق موزوں ہے؟

۲۷۔ ٹائپ اور کتابت کی غلطیاں کس حد تک موجود ہیں؟

۲۸۔ کیا غیر ضروری مواد تو شامل نہیں کیا گیا؟

۲۹۔ کہیں محض تنقیدی جملوں کا سہارا لے کر تو تحقیق انجام نہیں دی گئی؟

۳۰۔ کیا ضروری ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کیا ثانوی ماخذوں سے گریز اور ماخذوں پر تنقید موجود ہے؟

ان نکات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارا مجموعی جواب جو کچھ بھی ہوگا وہ تحقیقی معیار، اعتبار اور ساکھ کا تعین کر سکے گا۔